© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ نصف صدی میں اُمتِ مُسلمہ پر بالخصوص دینی نقطۂ نظر سے جو انحطاط آیا ہے اُس کے مُضر اثرات اُس کی قیادت اور سیادت میں بھی بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال بیشتر اِس ملت کی سربراہی کا منصب بالعموم اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہا جن کی زندگیاں دیکھ کر اِس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ انہیں اسلام سے گوناگوں تعلقِ خاطر ہے۔ مگر اب چند سالوں سے اِس قوم کی مسندِ قیادت پر وہ لوگ یکے بعد دیگرے براجمان ہو رہے ہیں جو اگرچہ اسلام سے اپنی گہری وابستگی کا اِس کثرت سے اظہار کرتے ہیں کہ اُسے سُن سُن کر لوگوں کے کان پک جاتے ہیں، مگر اُن کی عملی زندگی میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکے کہ اُن کی دینِ حق سے فی الحقیقت کوئی شناسائی ہے۔ مُسلم قائدین کی نجی اور معاشرتی سرگرمیوں کا قریب قریب وہی انداز ہے جو ہمیں مغربی قیادت کے اندر نظر آتا ہے۔ ماضی میں مسلمان کسی شخص کو سربراہی کا منصب سونپنے سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ وہ ارکانِ اسلام کا کس حد تک پابند اور منکرات سے کس حد تک گریزاں ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری میں اُس کا کیا مرتبہ اور مقام ہے اور دینی معاملات میں اُس کی سمجھ بوجھ کا کیا عالم ہے۔ لیکن آج مسلم قیادت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ جو شخص بھی جھوٹے دعوے کرنے میں جس حد تک جری اور بیباک اور الفاظ کے استعمال میں جس قدر مطلق العنان ہو، اُسی تناسب سے وہ قوم کا محبوب رہنما بنتا ہے۔ قوم اِس بات سے بے نیاز ہو چکی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ جس اسلام کی محبت کا یہ رہنما دعویدار ہے اُس کی کوئی رمق اُس کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے یا نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام پر اسلام کو مٹانے والی قیادتیں مسلسل اُبھر رہی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِس بے دین قیادت کے کام کرنے کا ایک ہی اسلوب ہے کہ پہلے مرحلے پر قوم کی معاشی زبوں حالی کا رونا رویا جائے اور بڑی دردمندی کے لہجے میں اُسے یہ باور کرایا جائے کہ یہ دنیا کی دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئی ہے لہٰذا اِسے کوئی ایسا قائد میسر آنا چاہیے جو اسے حالات کے تقاضوں کے مطابق دوسری اقوام کے ہم رکاب کر سکے۔ لیکن وہ یہ سارا کام اس حکمت اور دانائی کے ساتھ سرانجام دے کہ قوم فکر و عمل کے اعتبار سے اسلام سے دُور بھی ہوتی چلی جائے اور اس کو یہ احساس تک نہ ہونے پائے کہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دینِ حق سے بیگانہ بنایا جا رہا ہے اور اگر اُسے اِس مذموم منصوبہ کا شعور ہو بھی جائے تو وہ اُسے حالات کا تقاضا سمجھ کر خاموش رہے اور قیادت کو اس معاملہ میں قطعاً "موردِ الزام" نہ ٹھیرائے۔ اگر آپ اِس بے دین قیادت کے عزائم اور ان عزائم کی تکمیل کے طریقِ کار کو ایک ہی کتاب کے ذریعے سمجھنے کے خواہشمند ہیں تو مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی کتاب " فرینڈز ناٹ ماسٹرز " کا بغور مطالعہ کریں آپ کے سامنے وہ ساری تدابیر آجائیں گی جو مسلمانوں کی جدید قیادت انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے بالعموم اختیار کرتی ہے۔ آپ کو اس تصنیف میں مسلمانوں کی معاشی بدحالی کا تذکرہ بھی ملے گا، حالات کی سنگینی پر بھی زوردار مباحث نظر آئیں گے اور اسلام کو جدید سانچوں میں ڈھالنے کے لیے متعدد تجاویز بھی آپ کی نگاہ سے گذریں گی۔ اِس پوری کتاب کے مندرجات کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ایک قاری کے لیے اُن رہنما اُصولوں کو جاننا کچھ مشکل نہیں ہوتا جن کے مطابق مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمان قائدین عمل کر رہے ہیں۔ بس ایک مرتبہ مسلم معاشرے کے ذہن میں یہ باطل خیال بٹھا دیجیے کہ اُن کے مرض کا اصل علاج یہ ہے کہ انہیں حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو پھر اسلام کے خلاف بغاوت کی کوئی مہم شروع کیے بغیر قوم اسلام سے خود بخود بے تعلق ہو جائے گی۔

یہ صورتِ حال کچھ اُمتِ مُسلمہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ آج تک دنیا میں جتنی قومیں بھی حق و صداقت کے راستے سے بھٹکی ہیں انہیں حالات کے تقاضوں نے ہی گمراہ کیا ہے۔ یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا اور جاندار مخلوق کے مقابلے میں بے جان سکوں کی قدر و قیمت بڑھنے لگی اور ایسے مزدوروں کی ضرورت لاحق ہوئی جو کم سے کم معاوضہ قبول کر کے زیادہ سے زیادہ کام کر سکیں تو ان نئے تقاضوں کے تحت ہی سود کا انتہائی ظالمانہ نظام قائم کیا۔ اور عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر کارخانوں میں مردوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوش بدوش کام کرنے پر مجبور ہوئی اور اس طرح خاندانی نظام تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ اگر کوئی شخص حالات کے ان بے رحم تقاضوں کی تباہ کاریوں کا اندازہ کرنا چاہتا ہے تو اسے (TAWNEY) کی مشہور کتاب "مذہب اور سرمایہ داری کا فروغ" (RELIGION AND THE RISE OF CAPITALISM) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اسے دیکھنے سے اس کے سامنے یہ اندوہناک حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ کس طرح مغرب کے صنعتی اور معاشی تقاضوں نے "حالات کے تقاضوں" کا روپ دھار کر حضرت مسیح علیہ السلام کے پرستاروں کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مذہب کی مقدس قبا چاک کر کے اپنے آپ کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے یکسر عاری کر لیں اور وقتی تقاضوں کی بارگاہ میں صمیمِ قلب سے سجدہ ریز ہوتے ہوئے ہر اس کام کو سرانجام دینے کے لیے کمربستہ ہو جائیں، جس کا وقت مطالبہ کرتا ہے۔ اگر وقت حلال و حرام کے امتیازات کو مٹانے کی طرف اشارہ کرے تو لوگ انہیں پورے جذبۂ اطاعت گذاری کے ساتھ اپنے دل و دماغ سے محو کر دیں اور اگر حالات کے تیور دیکھنے سے یہ معلوم ہو کہ یہ فحاشی اور بے حیائی کے لیے سازگار ہوں تو پھر منکرات کو ایک فرض کی حیثیت سے پھیلایا جائے۔

بات ذرا طویل ہوتی جا رہی ہے، مگر اہلِ یورپ کا مذہب سے ایک تدریج کے ساتھ انحراف کا مطالعہ اسلام کے خادموں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں بھی لوگ مذہبی بندھنوں کو توڑتے رہے ہیں لیکن ماضی اور حال کے مذہب گریز رجحانات کے مابین ایک نمایاں فرق ہے۔ ماضی میں جب کوئی فرد یا گروہ مذہب سے بغاوت کرتا تھا تو وہ یہ غلط روش یا تو اپنے سفلی جذبات کی تسکین کی خاطر یا مادی مفادات کے حصول کے لیے اختیار کرتا تھا۔ لیکن مذہب کے خلاف جدید انسان کی بغاوت کا انداز ماضی کے مقابلہ میں یکسر جداگانہ ہے۔ آج کوئی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ مذہب کے بندھن اُس کے لیے ناروا بوجھ ہیں یا وہ مذہب کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا کیونکہ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے تو یہ اُس کے لیے اعترافِ شکست کے مترادف ہے اور آج کا انسان اس اعتراف کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اُس نے عوام کو مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے حالات کے تقاضوں کا سہارا لیا ہے اور کچھ اس انداز سے انہیں راہ راست سے بھٹکانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب اُس دَور کی ایک فطری ضرورت تھی جس دور میں اس نے جنم لیا۔ لیکن اب دنیا کے تقاضے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بدل گئے ہیں، لہٰذا کوئی "قدیم مذہب" اِس جدید دَور میں "نشۂ انسان" کی رہنمائی نہیں کر سکتا اور اس باطل خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عموماً یہ مثال دی جاتی ہے کہ آخر وہ لباس جو ایک شخص اپنے عہدِ طفولیت میں پہنتا تھا وہ اُس کے جوان ہونے کے بعد اُس کے جسم پر کس طرح راست آسکتا ہے؟ اور اگر اسے کوئی فرد یا گروہ راست کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کیا اس کی یہ حرکت دیوانگی سے کم ہے۔ اپنے اس نظریہ کی تائید میں یہ لوگ چند شواہد بھی فراہم کر دیتے ہیں جو بہر طور دورِ جدید کے معاشی حالات کی کوکھ ہی سے نکلے ہیں۔ مثلاً یہ صنعتی ترقی کے بارے میں ایک استدلال پیش کریں گے کہ اگر سودی کاروبار ختم ہو جائے تو سرمایہ کس طرح فراہم ہوگا اور اگر عورتیں گھر کی چار دیواری میں مقید کر دی جائیں تو کام کرنے والے ہاتھ کہاں سے آئیں گے اور اگر ضبطِ تولید سے کام لیتے ہوئے افزائشِ نسل پر پابندی عائد نہ کی جائے تو عوام کا معیارِ زندگی کس طرح بلند ہوگا اور اب اشتراکیت کے فروغ کے بعد یہ بات بھی کہی جانے لگی ہے کہ اگر ملک کے وسائل حکومت کی تحویل میں نہ دیے جائیں تو استحصال کا خاتمہ کس طرح ممکن ہوگا! مذہب دشمن عناصر یہ غلط استدلال اس زوردار طریق سے سامنے لاتے ہیں کہ سننے والا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں گویا وہ فطرت کے ناقابلِ تغیر اصول یا ٹھوس منطقی حقائق ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ وہ ایک طرف تو انہیں سو فیصد درست تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مذہب، اس کے معتقدات اور اُس کی تعلیمات کا جائزہ لے کر یہ دیکھتے ہیں کہ وقتی تقاضوں اور دینی مطالبات میں کہاں تک مطابقت پیدا ہو سکتی ہے اور جب اُن میں بُعد و بیگانگی محسوس کرتے ہیں تو کچھ مدت کے لیے اُن کے درمیان بالکل مصنوعی بلکہ غیر عاقلانہ فکری اور عملی تدابیر کے ذریعے مصالحت کرانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جلد ہی انہیں اِس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ وقتی تقاضے مذہبی تعلیمات سے ہر صورت میں ہم آہنگ ہی ہوں، بلکہ بسا اوقات ان کے درمیان اختلاف کی نہایت ہی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے جسے سطحی اور احمقانہ فلسفوں سے پاٹا نہیں جا سکتا۔ اور ایک دیانتدار شخص اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو مذہب کو تیاگ دے یا وقتی تقاضوں کے تحت حاصل ہونے والی مراعات سے اپنے آپ کو محروم کر لے۔

وقتی تقاضوں کے پرستار پہلے مرحلے پر دینِ حق کے خلاف کوئی لفظ کھل کر زبان پر نہیں لاتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ مذہب کے رُوحانی عُنصر کی تعریف ہی کرتے ہیں اور اس نسبت سے وہ اُن بزرگوں کی عزت و احترام کا بھی ڈھونگ رچاتے ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کے اندر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ شریعت کی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ ان ملحدین کا سارا زور صرف اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ دینی تعلیمات خصوصاً مطالباتِ شریعت اور "وقتی تقاضوں" کے درمیان اختلافات زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوں بلکہ اُن کے مابین شدید نوعیت کی آویزش جنم لے اور لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگے کہ مذہب اُن کی تغیر پذیر زندگی کی ہر آن بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لیے یا تو اُسے بالکل مسترد کر دیا جائے یا اُسے اجتماعی زندگی کے دائرہ سے نکال کر ذاتی زندگی تک محدود کر دیا جائے۔ چنانچہ پہلے مرحلہ میں ملحدانہ تحریکیں انسان کو مذہب سے متنفر نہیں کرتیں بلکہ اُسے اس امر کی تلقین کرتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ کر لیں کہ "فرسودہ مذہب" دورِ جدید کے اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ اِس بنا پر اجتماعی زندگی کے نظم ونسق کے لیے یہ ضروری ہے کہ اہل مذہب ایسے اصول اور ضابطے وضع کرنے کی اجازت دے دیں جو شریعت سے خواہ متصادم ہی ہوں مگر قوم کے لیے مفید اور کار آمد ہوں ـــ چنانچہ مذہب کے باغی اس مرحلہ پر بھی بڑی عیاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں دینی تعلیمات کا حلیہ بگڑتا ہے مگر سادہ لوح عوام کو یہی تاثر دیا جاتا ہے کہ فلاحِ ملت کی خاطر جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ دینی تقاضا ہی ہے۔ بعض سطح بین، شر پسند اور تنگ نظر افراد خصوصاً "ملا" اگرچہ ان کی اِن ملی خدمات کو دینی مسلمات کے خلاف ہی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں اُن کی اِن کوششوں سے دین کا حقیقی منشا پورا ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنی ہوسناکی کی تسکین کی خاطر عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر شمعِ انجمن بنانے کے درپے ہوتے ہیں اور اُسے آرٹ اور کلچر کے نام پر گمراہ کرنے کی مختلف چالیں چلتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ سارا کام عورت کی آزادی اور اس کے استحصال کے خاتمے کے نام پر کیا جاتا ہے اور اپنی فریب کاریوں پر پردہ ڈالنے اور اپنی مذموم کوششوں کو مقدس بنانے کی غرض سے قرآن مجید کی ان آیات کا حوالہ تو دیا جاتا ہے جن میں عورت کے بلند مرتبہ ومقام کا تذکرہ موجود ہے مگر وہ آیات ان کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہیں جن میں صنفِ نازک کو وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح اللہ کے دین کو مسخ کرنے والے ان جدید مفکرین کو یہ بات تو یاد ہے کہ دینِ حق انسان کی اجتماعی زندگی کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے، لیکن اس کے ہاں اجتماعی عدل کا جو مخصوص تصور ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جن تدابیر کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اُن سے ان حضرات کو کوئی سروکار نہیں۔ چنانچہ اجتماعی عدل کے نام پر یہ لوگ مسلم قوم پر اشتراکیت جیسا انسانیت سوز اور جابرانہ نظام مسلط کر دیتے ہیں اور یہ سارے مراحل اس طرح طے کیے جاتے ہیں کہ عام لوگوں کو اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ اجتماعی انصاف کے پردہ میں انہیں کس عذاب کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ بظاہر سارا زور اجتماعی عدل کی ضرورت اور اسلام میں اس کی غیر معمولی اہمیت پر دیا جاتا ہے۔ آخر اس پروپیگنڈا کے سامنے کون یہ بات کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ اسے اجتماعی عدل عزیز نہیں بلکہ اجتماعی ناانصافی مطلوب ہے۔

جب کوئی دینی مزاج کا حامل معاشرہ "اجتماعی عدل" پر پوری طرح ایمان لے آتا ہے اور اسے اپنی زندگی کی غایت اولیٰ قرار دے دیتا ہے تو پھر اس کے کان میں یہ بات پھونکی جاتی ہے کہ اگر ملک کے سارے ذرائع پیداوار مکمل طور پر حکومت کے قبضے میں نہ ہوں تو وہاں معاشی عدل کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی سے نہ صرف اخلاقی اقدار بدلتی ہیں بلکہ جذبات کی دنیا میں بھی غیر معمولی تغیر رونما ہوتا ہے۔ اس نصب العین کے حصول کی خاطر معاشرہ نہایت ہی ظالمانہ نوعیت کی جکڑ بندیاں قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ آزادی کی جگہ مسلکِ غلامی اختیار کرتا ہے اور اشیاء اور اعمال کی قدر و قیمت روحانی معیار سے جانچنے کے بجائے مادی نقطۂ نظر سے متعین کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کسی غیر معمولی خارجی دباؤ کے بغیر الحاد و دہریت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس المناک تبدیلی کے آغاز میں تو اس کے اندر "مذہبی حس" ایک مدھم سی لو کی طرح موجود رہتی ہے۔ لیکن جوں جوں وہ اجتماعیت کے دامِ فریب میں گرفتار ہونے کی وجہ سے الحاد کی طرف بڑھتا ہے تو یہ لو بھی گورِ غریباں کے افسردہ چراغوں کی طرح جلد گل ہو جاتی ہے۔ قلب و نگاہ کی دنیا تو اندھیر ہوتی ہی ہے، معیشت، معاشرت اور سیاست پر بھی الحاد کے تاریک سایے چھا جاتے ہیں اور انسان ایک ایسا حیوان بن جاتا ہے جس کی زندگی کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوتا کہ چوپایوں کی طرح ہر قسم کے اخلاقی احساسات سے عاری ہو کر مملکت کی چاکری کرے اور اس کے عوض نپا تلا چارہ حاصل کرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جسم وجان کے رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔

ایک ہوشمند انسان جب اس عذاب میں مبتلا ہوجاتا ہے تو پھر وہ یہ سوچتا ہے کہ اُسے تو اجتماعی عدل درکار تھا آخر اس کے حصے میں بھیانک قسم کی غلامی کیوں آئی ہے! عام حالات میں بھی جب سپنوں کے محل ٹوٹتے ہیں تو انسان کو اچھی خاصی اذیت ہوتی ہے لیکن سپنوں کے وہ محلات جن کے لیے انسان نے جسم وجان کی ساری قوتیں کھپا دی ہوں جب زمین بوس ہو کر انسان کو سنگین حقائق سے دوچار کرتے ہیں تو اُس کی زندگی ایک دردناک تجربہ بن جاتی ہے۔ یہی حال عدلِ اجتماعی کے اُن فریب خوردہ طلب گاروں کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں پر افسردہ خاطر ہو کر غور کرتے ہیں لیکن غور وفکر کے باوجود اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ ان کی ناکامی کی اصل وجہ خارجی حالات نہیں بلکہ اُن کی اپنی نادانی ہے۔ انہوں نے حماقت سے یہ باطل خیال اپنے ذہن میں بٹھا رکھا ہے کہ جن باتوں کو اُن کے دشمن حالات کے تقاضوں سے تعبیر کرتے ہیں وہ درحقیقت زندگی کے ایسے ٹھوس مسائل ہیں جن کا حل اُسی انداز میں ممکن ہے جس کی نشاندہی اعدائے دین کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی فریب کاریوں سے مسلمانوں کی قوتِ فکر وعمل اس حد تک مفلوج ہو کر رہ گئی ہے کہ وہ کسی غلط مقصد کے حصول کی خاطر طفلانہ اور غیر عاقلانہ تدابیر کو ہی زندگی کے ٹھوس حقائق سمجھ بیٹھے ہیں۔

اہلِ مغرب کی اس عیاری اور مسلمانوں کی اس ابلہ فریبی کی متعدد مثالیں مشہور مغربی مورخ ٹائن بی (TOYNBEE) کی شہرہ آفاق کتاب "مطالعۂ تاریخ" میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ تاریخ کا یہ عالم گذرے ہوئے حالات اور واقعات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ پوری انسانی تاریخ تحدی (CHALLENGE) اور معاکسۂ عمل (RESPONSE) کی کرشمہ سازی ہے۔ حالات کسی قوم کے سامنے چند نہایت ہی پیچیدہ نوعیت کے مسائل پیش کرتے ہیں جو اُس کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ قوم جو اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے فکر وعمل کو بروئے کار لاتی ہے وہ اگر انہیں حل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو دنیا میں سربلند ہوتی ہے اور ناکامی کی صورت میں (باقی برصفحہ ۴۶)

© rasailojaraid.com